ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.3 (2024)
(July to September)

شہ سر: بلتی زبان کے پہلے ناول کا تجزیاتی مطالعہ

Sha-sar: An Analytical Study of the First Novel in Balti Language

ڈاکٹر محمد نذیر (نذیر بیسپا)
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، جامعہ کراچی، کراچی

Dr. Muhammad Nazir (Nazir Bespa)
Assistant Professor, Department of Persian, University of Karachi,Karachi
nazibespa@uok.edu.pk

Abstract:
This paper is a critical analysis of the first-ever novel in the Balti language, "Sha-sar" by Afzal Rawish, published in early 2024. Balti is a language spoken in Pakistan's Baltistan region and India's Ladakh, which belongs to the western branch of Tibetan languages with strong Muslim identity since it parted ways with Tibet and the advent of Islam. Traditionally, Balti literature has always been poetic; there have been no remarkable literary works in prose. However, "Sha-sar" represents the initiation of Balti novel writing, comprising eight chapters that present the social and historical experiences of three generations in Baltistan. This paper looks at the narrative structure, language, and literary features of the novel, which attempts to identify and perceive the literary legacy of the Balti language. Since it is a relatively new subject, research throws light on the background of Balti language, its prose writing and its evolution in the sphere of literature. This research is of prime importance in focusing on and discovering Balti's literary contributions and for fostering an understanding of regional literature in Pakistan.

Keywords: Sha-sar, Balti Novel, Gilgit-Baltistan, Afzal Rawish, Regional Literature, Balti's literary.

مقدمہ:

بلتی زبان پاکستان کے زیر انتظام شمالی سرحدی علاقے بلتستان کی اکثریتی آبادی کی مادری زبان ہے جو اس وقت سکردو، شگر، خپلو اور کھرمنگ کے نام سے چار انتظامی اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ زبان معمولی فرق کے ساتھ لداخ کے کرگل اور لیہ سمیت دیگر کئی علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ لسانی ماہرین کے مطابق بلتی زبان چینی-تبتی (Sino-Tibetan) زبانوں کی تبتی-برمی (Tibeto-Burman) شاخ سے ہے۔ (۱) چودھویں صدی میں بلتستان میں اشاعت اسلام کے بعد عربی فارسی زبان کے الفاظ خاص طور پر اسلامی اصطلاحات کی آمیزش اور رسم الخط کی ایگے (تبتی رسم الخط) سے ابجد (عربی-فارسی) میں تبدیلی کے بعد آہستہ آہستہ بلتی اور تبت کی دیگر زبانوں میں بنیادی اختلافات وجود میں آئے اور آج بلتی تبت کی دیگر زبانوں سے جداگانہ شناخت کی حامل ہے۔ بلتی پاکستان میں بولی جانے والی واحد تبتی زبان ہے (۲) اور زیادہ تر تبتی مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ (۳)

بلتی کا قدیم علمی اور ادبی ورثہ تبتی زبان کے ساتھ مشترک ہے۔ البتہ مابعد اسلام بلتی زبان کا ادبی ورثہ زیادہ تر شعری قالب میں اور مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے اور بد قسمتی سے اب تک نثری ادب کے حوالے سے بلتی زبان کا دامن خالی ہے۔ بلتستان کے معروف محقق غلام حسن حسنو لکھتے ہیں:

> "بلتی زبان کا قدیم سرمایہ زیادہ تر شعر و شاعری پر مبنی ہے چوں کہ اپنی قدامت کے علی الرغم بلتی نثر میں دوسرے تمام اصناف ادب تا حال عنقا ہیں۔ لداخ اور تبت وغیرہ میں کوئی پیشرفت ہوئی ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ بلتستان میں نثری ادب کا کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، تمثیل، آب بیتی، سفر نامہ، داستان تا حال تخلیق نہیں ہوئی ہے۔"(۴)

بلتی کے شعری ادب سے قطع نظر اگر ہم صرف نثری ادب کا جائزہ لیں تو چند ایک نثری کاوشوں کا پتہ چلتا ہے جن کا زیادہ حصہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہے۔ بلتی زبان کا قدیم نثری ادب زیادہ تر داستانوں اور کہانیوں کی صورت میں سینہ بہ سینہ چلتا رہا ہے۔ بلتی زبان کی سب سے مشہور طویل داستان "ہلا فو کیسر" کی داستان ہے جو بارہ یلداق (ابواب) پر مشتمل ہے اور بلتستان کے علاوہ تبت، لداخ، منگولیا، نیپال وغیرہ میں بھی مشہور ہے۔(۵) لوک داستانوں کے بعد سب سے پہلے ۱۸۹۴ء سے ۱۹۳۸ء تک بلتستان آنے والے عیسائی مبلغین نے انجیل کے بعض حصوں کا بلتی میں ترجمہ کرایا۔(۶) یہ تراجم "کھوم لو کھسی لم" (راہ نجات) کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں ۱۹۵۰ء میں شایع ہوئے۔ اس کے علاوہ قرآن کے بلتی میں دو تین ترجمے ہوئے ہیں جن میں سے محمد یوسف حسین آبادی کا بلتی ترجمہ ۱۹۹۵ء میں شایع ہوا ہے۔ ان تراجم کے بعد ریڈیو پاکستان سکردو نے ریڈیو ڈرامے اور کچھ افراد نے انفرادی طور پر بلتی میں سٹیج ڈرامے تحریر کئے ہیں جو آڈیو اور ویڈیو کی صورت میں ریڈیو پاکستان سکردو یا مختلف افراد کے پاس موجود ہیں لیکن ابھی تک کسی کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے۔ راجہ حامد حسین کلیم، آغا شاکر حسین، محمد عباس کھر گرونگ اور غلام عباس سودے بلتی کے مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔(۷) اس کے علاوہ بلتستان دائرۃ المصنفین کے توسط سے ایک کتابچہ ۲۰۱۵ء میں شایع ہوا ہے جس میں ۱۵ کے قریب مضامین اور کہانیاں بلتی زبان میں شایع ہوئی ہیں جس میں "ہر کنگ" کے عنوان سے غلام حسن حسنی کا لکھا ایک بلتی افسانہ بھی شامل ہے۔(۸) بلتی زبان میں باقاعدہ طور پر افسانوی ادب کی تخلیق کا سہرا محمد افضل روش کے سر ہے جس نے پہلی بار بلتی زبان میں گیارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ "پھہ ہر تخ" (پدری نشانی) ۲۰۰۵ میں شایع کیا۔(۹)

بلتستان میں ناول نگاری ایک نئی صنف ہے۔ بلتی ناول "شہ سر" سے قبل تین چار اردو ناول سامنے آچکے ہیں۔ میری نظر میں بلتستان کا پہلا ناول نگار اسماعیل دولتی کو اردوی (وفات: ۶ فروری ۲۰۲۴ء) ہیں جن کا غیر مطبوعہ اردو ناول "شرط ہفتم" میں نے ۱۹۹۷ء میں پڑھا تھا البتہ اس کا سال تصنیف اس سے کئی برس پہلے کا ہے۔ حالیہ برسوں میں بلتستان میں اردو کے تین ناول گلگت بلتستان کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ سب سے ۲۰۲۰ء میں محمد حسن حسرت کا ناول "دشت وفا کے ادھورے خواب"، ۲۰۲۱ میں ابو رگیاشر کا "بہرام شاہ مقپون" اور ۲۰۲۳ء میں احسان دانش کا "فڑہ" چھپ کر شایع ہوئے ہیں، جن پر اب تک کوئی تنقیدی یا تجزیاتی کام نہیں ہوا ہے۔

بلتی زبان کے پہلے ناول نگار ہونے کا اعزاز بھی افضل روش کے حصے میں آیا ہے۔ ان کا بلتی ناول "شہ سر" ۲۰۲۴ء کے آغاز میں ہی چھپ کر سامنے آیا ہے۔ بلتی زبان کے پہلے ناول ہونے کے سبب "شہ سر" نہ صرف بلتستان بلکہ پورے پاکستان کی ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "شہ سر" بلتی زبان کے پہلے ناول ہونے کے ساتھ بلتستان کے ماضی قریب کی تہذیبی اقدار،

طبقاتی کشمکش، علاقائی رسوم و رواج، رہن سہن، شادی بیاہ، موسمی تغیر و تبدل، زراعت و باغبانی، مذہبی اور ثقافتی تہوار اور تاریخی واقعات کا ایک آئینہ ہے۔ تہذیبی زوال اور لسانی انحطاط کے اس دور میں معدومیت کے خطرے سے دوچار ایک زبان کے احیاو بقا کے لیے ایسی تصنیف کا سامنے آنا امید افزا بات ہے۔ خاص طور پر نثری ادب سے خالی ایک بے یار و مددگار زبان کے آسمان ادب پر "شہ سر" جیسے سیر اب بادل کا نمودار ہونا یقیناً بلتی زبان اور بلتستان دونوں کے لیے ایک حیات بخش نوید ہے کیوں کہ زمانے کے تغیر و تبدل کے نتیجے میں معدوم ہوتی بلتی تہذیب کو محفوظ رکھنے اور بلتی زبان کے دوام کے لیے یہ ناول ایک قابل قدر کوشش ہے۔

"شہ سر" جنوری ۲۰۲۴ کو چھپ کر سامنے آیا ہے۔ کتاب کا سائز ۲۲×۵ / ۱۴ ہے۔ جلد سیاہی مائل سرخ رنگ کی ہے اور سر ورق پر جہاں کتاب کا عنوان درج ہے وہ جگہ زردی مائل سنہری رنگ کی ہے۔ عنوان اردو خط میں لکھا ہے اس کے نیچے ایگے (Yige) رسم الخط میں لکھا ہوا کتاب کا نام بلتستان سے بھوٹان تک پھیلی ہوئی بلتی- تبتی لسانی اکائیوں کو ایک قلبی تعلق میں جوڑتا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد "بلتی ناول" لکھ کر کتاب کی نوعیت واضح کی گئی ہے جس کے نیچے دو طرفہ محرابی ڈیزائن کے ایک سنہرے خانے میں افضل روش یعنی مصنف کا نام لکھا ہوا ہے۔ کتاب کی پشت پر مصنف کی تصویر ہے جس میں سر کے پیچھے لمبے بال اور بہت ہی لمبی کشادہ پیشانی ان کی فکری ریاضتوں کا پتہ دیتی ہے۔ چہرے پر سفید بال جس میں موجود خال خال سیاہ بال بھی گزری بہار کی داستان سنا رہے ہیں اور تصویر کے نیچے بلتستان کے مایہ ناز محقق اور قلم کار محمد حسرت صاحب کی تعارفی تحریر درج ہے۔ سر ورق کے اندرونی فلیپ پر راقم (ڈاکٹر نذیر بیسپا) کی ایک مختصر تعارفی تحریر جب کہ دوسری طرف کے فلیپ پر بلتی زبان شناس اور شاعر جناب ایم اے مہدی آبادی کی تحریر کردہ ادبی فن پارہ موجود ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر "بسم اللہ" درج ہے۔ صفحہ نمبر دو سفید ہے اور صفحہ نمبر تین پر کتاب اور مصنف کا نام درج ہے۔ صفحہ نمبر پانچ پر کتاب کا معلوماتی صفحہ ہیں۔ ناشر کا نام درج نہیں ہے۔ غالباً مصنف خود اس کا ناشر بھی ہیں اسی لیے جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ رکھے گئے ہیں۔ انتساب مصنف نے اپنی ماں کے نام کیا ہے جس کو ایک بلتی قطعے کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر چھ اور آٹھ سفید ہیں جب کہ صفحہ نمبر سات پر فہرست درج ہے جس میں آٹھ ابواب کا ذکر ہے اور ابواب کے لیے مصنف نے "یلداق" کا لفظ استعمال کیا ہے جو بلتی میں فصل یا باب کتاب یا کہانی کی قسط کے لیے مستعمل ہے۔ اس کے بعد پانچ صفحات میں مصنف نے اپنا پیش لفظ "جوفل" کے عنوان سے بلتی زبان میں تحریر کیا ہے جس میں کتاب کے سبب تالیف اور اہداف کا ذکر کیا ہے اور درجن بھر افراد کا نام لے کر شکریہ ادا کیا ہے۔ ناول کا اصل متن صفحہ نمبر ۱۴ سے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جو مجموعی طور پر ۱۴۶ صفحات بنتے ہیں۔ کتاب کا خط (فونٹ) اردو نستعلیق ہے جو بلتی زبان کے لیے ساز گار نہیں ہے۔ فونٹ کا سائز بھی مروجہ سائز سے بڑا لگ رہا ہے۔

"شہ سر" کے مصنف افضل روش بلتستان کے ادبی اور سماجی حلقوں میں ایک مشہور و مقبول نام ہیں۔ اردو کے دو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں البتہ بلتی زبان میں کوئی شعری مجموعہ اب تک چھپا نہیں۔ شاعری تو بلتی میں بھی کمال کی کرتے ہیں لیکن نثری ادب کے حوالے سے بلتی زبان کی تہی دامنی ان کے دامن سے ایسی چمٹی رہی ہے کہ ہمیشہ بلتی کی نثری تخلیقات کی اشاعت کو شعری مجموعے کی اشاعت پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کا اصل نام محمد افضل اور ان کے والد کا نام حسین علی ہے۔ بلتستان کے صدر مقام سکردو کے نواحی گاؤں قمراہ کے میں ۷ جولائی ۱۹۷۵ کو پیدا ہوئے۔ مڈل تک کی رسمی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اس کے بعد ۱۹۸۹ میں سکردو شہر کے ہائی سکول نمبر ایک میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۹۱ میں انہوں نے سائنس میں میٹرک مکمل کیا۔ ۱۹۹۲ء میں گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی فیصل آباد کے شعبہ برقیات میں داخلہ لیا اور ۱۹۹۵ء میں فیصل آباد بورڈ سے ایف اے پاس کر لیا اور پھر اسی ادارے سے

۱۹۹۷ء میں الیکٹریکل میں ڈپلوما حاصل کیا۔ ۲۰۰۶ء محکمہ برقیات گلگت بلتستان میں سب انجنیئر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ دوران ملازمت ہی مہران یونیورسٹی جامشورو سندھ سے الیکٹریکل میں بی ٹیک کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ بعد ازاں ادبیات سے قلبی لگاؤ کے باعث ۲۰۲۲ء میں قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی گلگت سے اردو میں ایم اے کی سند بھی حاصل کر لی۔

اگرچہ کم عمری سے شاعری کرتے رہے ہیں لیکن پہلی بار سکردو میں ۱۴ اگست ۱۹۹۱ کو یوم آزادی کے مشاعرے میں اپنا کلام پیش کیا۔ شروع میں پروفیسر حشمت علی کمال الہامی مرحوم سے اور بعد میں غلام حسن حسنی مرحوم سے کلام کی اصلاح لیتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ "عدیم" تخلص کرتے تھے، لیکن عدیم ہاشمی کے نام سے واقفیت کے بعد ۱۹۹۴ء میں پروفیسر حشمت کمال الہامی کے مشورے سے اپنا تخلص "روش" اختیار کیا ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے مختلف ادبی اور علمی محافل میں شرکت کرتے رہے اور مقامی مجلات اور اخبارات میں تسلسل کے ساتھ اپنا کلام شایع کرواتے رہے۔ ۱۹۹۴ء میں باقاعدہ طور پر "حلقہ علم و ادب بلتستان" سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۹۹ء میں انہوں نے بعض ہم خیال شعرا کے ساتھ مل کر ایک نئی ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی، جس کا نام غلام حسن حسنی کی تجویز پر "بہار ادب بلتستان (باب) سکردو" رکھا گیا۔ ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء تک "باب" کے صدر رہے۔ اپنی صدارت کے دوران انہوں نے بلتستان کے شعرائے متقدمین کے فن و شخصیت پر کئی سیمینار بھی منعقد کروائے اور مشاعروں کے ساتھ تنقیدی نشستوں کا بھی اہتمام کیا۔ نومبر ۲۰۲۱ء میں افضل روش پاک برٹش آرٹس انٹرنیشنل کا کو آرڈینیٹر برائے بلتستان ریجن مقرر ہوئے اور دسمبر ۲۰۲۱ء میں وہ پاک برٹش آرٹس بلتستان ریجن کے صدر منتخب ہوئے۔ افضل روش کی تجویز پر کئی ادبی تنظیموں کے اشتراک سے ایک ادبی ادارہ بنایا گیا، جس کا نام انہوں نے "ارتقا" تجویز کیا۔ ادبی اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ اپنے آبائی گاؤں کی فلاحی تنظیم "قرار" کے لیے ان کی خدمات قابل قدر ہیں جس میں ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۹ء تک بانی صدر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ (۱۰)

۲۰۰۴ء میں انہوں نے اپنا پہلا اردو کا شعری مجموعہ "درد پا" شایع کیا۔ اسی دوران ان کو بلتستان کی معدوم ہوتی زبان اور مٹتی ہوئی تہذیب و ثقافت کا شدت سے احساس ہوا اور بلتی کے نثری ادب کا میدان خالی نظر آیا تو انہوں نے اس میدان میں اپنی صلاحتیں آزمانے کا ارادہ کر لیا اور اپنے استاد حشمت علی کمال اور معروف مورخ محمد حسن حسرت کے مشورے سے بلتی زبان میں افسانہ نویسی کی ابتدا کی اور دسمبر ۲۰۰۴ء میں گیارہ افسانے لکھے جو ۲۰۰۵ء میں "پھہ ہر تخ" کے نام سے شایع ہوئے۔ یوں افضل روش کو بلتی زبان کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کا "چی لدن می لدنی لعنن" (طلسماتی تھال) انگریزی ترجمے کے ساتھ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے رسالہ "Successful Stories" میں چھپ چکا ہے۔ ان کا دوسرا اردو کا مجموعہ کلام جنوری ۲۰۲۳ء میں "فلک شگاف" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اردو کا ایک اور بلتی کے دو مجموعہ کلام اس وقت زیر طبع ہیں۔

زیر نظر ناول کا عنوان "شہ" اور "سر" دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ "شہ" بلتی زبان میں گوشت اور "سر" نئے کو کہا جاتا ہے۔ اس سے عام طور پر "زخم" یا "زخم کا دوبارہ ہرا ہونا" مراد لیا جاتا ہے۔ محمد علی شاہ کی "بلتی اردو لغت" میں "شہ سر" کا مطلب "تازہ گوشت" یا "جلد پھٹ جانے کے بعد نکلا ہوا گوشت" درج ہے۔ (۱۱) مصنف نے خود بھی اس کے پیش لفظ (جو فل) میں پیش نظر اہداف و مقاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ وہ اس ناول کے ذریعے بلتستان کے آداب و رسوم، تہذیب و ثقافت اور زبان کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ کہانی کی صورت میں گزشتہ ادوار کے مشکل حالات، معاشی اور موسمی سختیاں، غریب اور کمزور لوگوں کے ساتھ ہونے والے معاشرتی جبر اور ناانصافی، متنوع طرز زندگی، ڈوگروں کے ساتھ ہونے والی

جنگ کے واقعات کی تصویر کشی کرنا چاہتے ہیں تا کہ بلتی زبان و ثقافت سے جڑے ماضی کی یادوں کے زخم کو پھر سے ہرا کر سکیں اور یوں لوگ اپنے ماضی اور تہذیب و زبان سے جڑے رہیں۔ (۱۲)

مصنف کے بیان اور عنوان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول ایک ایسی کوشش ہے جس میں مصنف نے بلتی قوم کی لسانی اور تہذیبی جذبات کو اپنے مضراب قلم سے چھیڑ کر بیدار کرنے اور بلتی کی معدومیت کے احساس سے جڑے داغ دل کو ناخن تحریر سے کھرچ کر پھر سے ہرا کرنے کی کوشش کی ہے۔

تحقیق کے بنیادی اہداف، سوالات اور منہج:

افضل روش کا نو تصنیف ناول "شہ سر" بلتی زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا اور تاریخی کارنامہ ہے۔ ناول نگار نے بلتستان کے ثقافتی اور لسانی ورثے کو دستاویزی شکل دے کر محفوظ کرنے کے لیے ناول کی صنف کا انتخاب کیا ہے، تا کہ نئی نسل کو کہانی کے انداز میں بلتستان کی تاریخ، سماجی اقدار، طرز معاشرت، بود و باش، غم اور خوشی کی تقریبات، زبان و بیان کی مختلف جہات اور دیہاتی ماحول کی خوبیوں اور خامیوں سے روشناس کرایا جا سکے۔ "شہ سر" بلتی معاشرے کے گزشتہ چھ سے سات عشروں کی ایک جامع تصویر پیش کرتا ہے جس میں بلتی سماج کے کئی پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناول بلتستان کے طاقتور اور پسماندہ طبقات کے درمیان موجود کشمکش کو بھی اجاگر کرتا ہے اور سماجی نظام اور عام انسانوں کی زندگی میں بدلاؤ کے لیے تعلیم کے کردار کو بھی واضح کرتا ہے۔ لہذا اس مطالعے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہم "شہ سر" کے عناصر ترکیبی کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے بنیادی موضوعات، اہداف اور اہمیت کا تعین، نیز بلتی کی ثقافتی شناخت اور لسانی سرمائے کے تحفظ و دوام کے لیے افضل روش کی کاوشوں کی نشان دہی کر سکیں۔

اس تحقیق کی مدد سے ہم "شہ سر" سے متعلق کچھ بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس ناول میں بلتستان کے کون سے سماجی یا ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے؟ بلتستان کے کون سے زمانی ادوار کے تناظر میں ناول کے پلاٹ ترتیب دئے گئے ہیں؟ معاشرے کے کن طبقات کی نمائندگی نظر آتی ہے؟ کن سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے؟ بلتی ثقافتی اور لسانی ورثے کو بچانے کے لیے کیسا اسلوب یا زبان استعمال کی گئی ہے؟ اور ناول نگار اپنے مقصد میں حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟

اس تحقیق میں تجزیاتی تحقیقی منہج کے تحت ناول کے اجزا کا بغور مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور متن کے تجزیاتی مطالعے کے بعد موضوعات، زمان و مکان، کردار، واقعات، مکالمے اور لسانی اسلوب کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ناول کی ادبی، لسانی، سماجی اور ثقافتی اہمیت کی جامع تفہیم ممکن ہو گی۔

سابقہ تحقیقات کا پس منظر:

بلتی زبان و ادب پر اب تک انجام شدہ تحقیقات کا دائرہ بہت محدود ہے۔ بلتی زبان کے بعض لسانی پہلوؤں اور بلتستان میں اردو ادبیات کے تناظر میں چند ایک تحقیقی مقالے اور رسالے لکھے گئے ہیں لیکن بلتی کے نثری ادب کے حوالے سے تخلیقی اور تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلتی زبان میں افسانوی ادب کا آغاز ہی بیس سال قبل ہوا ہے لہذا اس موضوع پر باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ بلتستان میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کی آخری عشروں میں ہوا ہے۔ حال ہی میں بلتستان سے تعلق رکھنے والے اردو ادبیات کے محقق محمد نذیر نے اپنی استاد ڈاکٹر ذکیہ رانی کے تعاون سے ایک تحقیقی مقالہ "بلتستان میں اردو افسانے کا ارتقاء" کے عنوان سے لکھا ہے جس میں بلتستان کے اردو افسانوں کے تاریخی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے کے مطابق بلتستان کا پہلا اردو افسانہ نگار غلام عباس ہے جس کا افسانہ "عظیم انسان" ۱۹۷۰ میں شایع ہوا۔ اس کے بعد غلام حسن حسنی کے اردو افسانوں کا مجموعہ "گیت بنے

انگارے "۲۰۰۵ میں شایع ہوئے۔ اس کے علاوہ حسن حسرت، حشمت کمال الہامی، غلام حسن لوبسانگ بھی بلتستان کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ (۱۳)

افضل روش کا زیر مطالعہ بلتی ناول حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے لہذا اس ضمن میں اب تک کوئی بھی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ ایک مختصر مضمون "شہ سر" کے عنوان سے گلگت بلتستان کے مقامی روزنامہ "سلام" اور "بادشمال" میں شایع ہوا ہے، جسے محمد رضا ربانی نے تحریر کیا ہے۔ البتہ افضل روش کے بلتی افسانوں پر اب تک بی ایس کی سطح کے دو مقالے مختلف جامعات میں لکھے جا چکے ہیں۔ پہلا مقالہ ۲۰۲۳ء میں جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے ایک طالب علم آصف عباس نے بی ایس اردو کی سند کی تکمیل کے لیے "افضل روش کے بلتی افسانوں کا اردو ترجمہ و تجزیہ" کے عنوان سے لکھا ہے۔ جب کہ دوسرا مقالہ جامعہ کراچی کے طالب علم معروف شاہ نے ایم اے اردو کی سند کے لیے "پھہ ہر تخ کے منتخب افسانوں کے تراجم" کے عنوان سے ۲۰۲۳ء میں مکمل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۱۸ میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز کے ایک طالب علم غلام رسول نے اپنے اردو ایم اے کا تحقیقی مقالہ "افضل روش کی شاعری میں مزاحمتی عناصر" کے عنوان سے لکھا ہے۔ شہ سر کے حوالے سے اب تک کوئی تحقیقی کام انجام نہیں پایا ہے اور اسی خلا کو پر کرنے اور نئی نسل کو اس ناول کے اجزائے ترکیبی سے روشناس کرنے کے لیے یہ تجزیاتی مطالعہ انجام دیا گیا ہے۔

شہ سر کا خلاصہ:

شہ سر ناول "کی کہانی "خوسور گرونگ" نام کے ایک خیالی گاؤں کے ایک متوسط خاندان کے گرد گھومتی ہے جو کھیتی باڑی کے ذریعے گزر بسر کرتا ہے۔ کہانی کے پلاٹ اسی خاندان کے چھوٹے موٹے گھریلو مسائل اور کھیتی باڑی سے جڑے واقعات کے ایک مربوط تسلسل سے تشکیل پاتے ہیں۔ کہانی کا پہلا منظر "خوسور گرونگ" کے چوپال کا ہے جہاں چنار کے درخت کے نیچے اخوند خدایار اور ترنگپا وانگ چوک سمیت گاؤں کے چند افراد بیٹھے ماضی کے واقعات پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک گاڑی آ کر رکتی ہے، جس میں سے ایک تعلیم یافتہ نوجوان سکر چن باہر نکل کر چوپال کا رخ کرتا ہے۔ اخوند خدایار اس کو اپنے اور ترنگپا وانگ چوک کے ساتھ چنار کے تنے کے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے۔ نوجوان اپنے غریب خاندانی پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ چنار سے ٹیک لگانے والے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ گاؤں کے نمبر دار ترنگپا وانگ چوک نوجوان کو دی جانے والی عزت پر تحقیر آمیز انداز میں طنز کرتا ہے۔ اخوند خدایار دونوں کو خاموش کرنے کے لیے ایک داستان سنانا شروع کرتا ہے جو "خوسور گرونگ" کے گزشتہ پچاس ساٹھ برس کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں سکر چن ہی کے دادا اوت چن کا خاندان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خاندان اوت چن، اس کی بیوی سلطن بی، بڑا بیٹا علی (سکر چن کا باپ)، احمد، رگیالو اور فطیم بی پر مشتمل ہے جن میں علی کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ کہانی بلتستان کی آزادی سے ایک سال قبل موسم خزاں سے شروع ہوتی ہے اور مصنف بڑی خوبصورتی کے ساتھ پہلے سال کے ہر موسم کی منظر کشی کرتا ہے اور پھر موسم کے حساب سے اوت چن کے خاندان کے شب و روز کے معمولات اور سماجی طور طریقوں اور مذہبی اور سماجی تہواروں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ خزاں کے موسم میں فصل اٹھانے کے بعد مالیہ اور سرکاری واجبات ادا کئے جاتے ہیں جس میں عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں بھی نظر آتی ہیں۔ کھیتی باڑی کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد یہ خاندان ایک نیا کھیت بنانا شروع کرتا ہے جس میں کرگل کا ایک نوجوان "سینگے" مزدور کی حیثیت سے حصہ لیتا ہے۔ سینگے ناول کے اختتام تک کہانی میں موجود رہتا ہے جس کو ناول کا دوسرا اہم کردار کہا جا سکتا ہے۔ موسم سرما کے دشوار ترین دن تہہ خانوں میں گزارتے ہیں جسے کڑا کہا جاتا ہے اور جب بہار کا موسم آتا ہے تو اوت کا خاندان سمیت گاؤں کے لوگ دوبارہ روزمرہ کے

زرعی کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران آزادی بلتستان کی جنگ شروع ہوتی ہے جس میں علی اور سینگے بھی بطور مجاہد حصہ لیتے ہیں۔ ڈوگر اراج کے خاتمے کے بعد بلتستان پاکستان میں شامل ہوتا ہے۔ اسی سال موسم خزاں میں فصل کی گہائی کے دوران علی جنگ سے واپس آتا ہے اور گندم، جو اور دیگر اناج گھروں میں منتقل ہونے اور کھیتی باڑی کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد علی کی شادی گاؤں کی ایک لڑکی میندیگار سے ہو جاتی ہے۔

علی شادی کے فوراً بعد فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ کرگل کا نوجوان سینگے بھی علی کے ساتھ فوج میں شامل ہو کر مختلف محاذوں پر ڈیوٹی دیتا ہے۔ سینگے کرگل کے اپنے عزیزوں کو یاد کرتا رہتا ہے اور اسی ذہنی خلفشار کی وجہ سے تقریباً کوئی پندرہ سال بعد اس کو میڈیکل بنیاد پر فوج سے فارغ کیا جاتا ہے اور وہ سکردو میں مستقل آباد ہو جاتا ہے۔ تقریباً بیس برس گزرنے کے بعد علی کی والدہ کا انتقال ہوتا ہے اور علی چھٹی پر گھر آتا ہے۔ اسی دوران سینگے اوت چن سے تعزیت کرنے خوسور گرونگ جاتا ہے۔ اس موقع پر اوت چن کے سمجھانے پر سینگے میندیگار کی بیوہ بہن سے شادی کرتا ہے۔ علی (۱۹۷۱ء کی) پاک بھارت جنگ میں بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے جس پر اس کو ترقی دے کر صوبیدار بنانے کی سفارش کی جاتی ہے لیکن دوسری طرف اس کے والد اور بھائی احمد کا گاؤں کے ایک بااثر شخص واتھول سے جھگڑا ہوتا ہے جس کو گاؤں کے نمبر دار ترنگپا وانگ دول کی آشیر باد حاصل ہوتی ہے۔ اس جھگڑے میں احمد بری طرح زخمی ہوتا ہے جس کے بعد علی اپنے والد کے کہنے پر قبل از وقت فوج سے ریٹائرمنٹ لے لیتا ہے۔ اس کی ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد اوت چن کا بھی انتقال ہوتا ہے۔ تقریباً ایک سال بعد علی اور سینگے دونوں کے ہاں ایک ایک بیٹا ہوتا ہے۔ علی کے بیٹے کا نام "سکر چن" اور سینگے کے بیٹے کا نام "سنگ سنگ" رکھا جاتا ہے۔ دوران ملازمت علی بہت ساری جائداد خریدتا ہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد جائداد سے زیادہ اپنے خاندان اور قبیلے کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلاتا ہے۔ چند سال بعد علی کا انتقال ہوتا ہے لیکن اب اس کا بیٹا سکر چن وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بلتی زبان، ادب اور تاریخ کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کرتا ہے اور ان کے علمی کاموں کی وجہ سے پورے علاقے میں عزت اور احترام کا مالک بن جاتا ہے اور یوں معاشرے کے غریب طبقے سے ہونے کے باوجود معاشرے کے مقتدر طبقات سے بہتر مقام حاصل کرتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر اخوند خدا یار سکر چن اور نمبر دار وانگ چوک کے درمیان صلح صفائی کراتا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس دور میں بندے کی عزت کا دارومدار اس کے خاندانی پس منظر کے بجائے اس کی اپنی ذاتی قابلیت پر ہے لہذا گزشتہ کل کی یادوں میں گم رہنے کے بجائے آنے والے کل کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

شہ سر کے عناصر ترکیبی کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ:

"شہ سر" بلتستان کے سماجی پس منظر میں لکھا گیا ایک مختصر ناول ہے جس میں بلتستان کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ایک نسل وہ ہے جو ۱۹۴۸ء میں بلتستان کی آزادی سے پہلے قبل ڈوگرا دور حکومت میں ظلم و جبر کے زیر اثر زندگی بسر کر رہی ہے۔ کھیتی باڑی اور محنت مشقت کے بعد زمین یا حیوانات سے جو آمدن حاصل ہوتی ہے اس کا ایک خاص حصہ کھرزن (شاہی محل کا حصہ) اور مالیات کی صورت میں ادا کرنے پر مجبور ہے۔ اگر مقررہ ٹیکس میں تھوڑی بھی کمی بیشی ہوتی ہے تو سخت سزائیں سنائی جاتی ہیں۔ ہر گاؤں میں حکومتی نمائندے موجود ہیں جن کو ترنگپا (نمبر دار) کہا جاتا ہے اور ان کے نیچے کنگ سکن (جانشین) موجود ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے مالیات جمع کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ معاشرے میں سب سے کمزور طبقہ موچی، موسیقار وغیرہ ہے۔ دوسرا طبقہ عام افراد کا ہے جو اپنی مختصر جائداد کے مالک ہوتے ہیں اور محنت و مشقت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ تیسرا گروہ مذہبی علما کی صورت میں نظر آتا ہے جس کو مقامی زبان میں اخوند کہا جاتا ہے۔ ہر گاؤں کا نمبر دار اپنے آپ کو دیگر افراد سے بالاتر سمجھتا ہے اور ان کی کوشش

ہوتی ہے کہ عام افراد مال و دولت اور جائیداد کے لحاظ سے ان کی برابری نہ کر پائیں۔ ان سب کے اوپر وزیر اور پھر راجہ یا حکمران طبقہ ہوتا ہے البتہ سادات کو بلتی معاشرے میں اعلیٰ مقام دیا جاتا ہے۔ شہ سر کے مصنف نے اپنی کہانی کو نمبر دار اور اس سے نچلے کے طبقات تک محدود رکھا ہے البتہ سادات کا کردار بھی ناول میں موجود ہے۔ اوت چن، واتھول، وانگ دول اور احمد شاہ وغیرہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو آزادی کے بعد ۲۰ سے ۲۵ برسوں میں وفات پا جاتے ہیں۔

دوسری نسل وہ ہے جو آزادی سے قبل پیدا ہوئی ہے لیکن عمر کا زیادہ حصہ آزادی کے بعد کے دور میں گزارتی ہے۔ علی، احمد، سینگے وغیرہ اسی نسل کے نمائندے ہیں۔ اس نسل کے لوگ قدیم طبقاتی جبر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ معاشرے میں اب بھی ترنگپا (نمبر دار) وانگ دول جیسے لوگ موجود ہیں جو اپنے سابقہ اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن اب عام لوگ آزادی کی نعمت کے سبب فوج سمیت مختلف سرکاری اداروں میں ملازمت کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ بالا دست طبقات کی اجارہ داری کو چیلنج کر رہے ہیں اور مال و دولت اور جائیداد کی بنیاد پر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شہ سر بنیادی طور پر اسی نسل کی پوری زندگی کو بیان کرتا ہے۔

تیسری نسل آزادی کے بیس پچیس سال بعد وجود میں آئی ہے۔ یہ نسل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور علم و فضل کے سبب سماج میں عزت و احترام کی حامل ہے اور سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے۔ علی کا بیٹا "سکر چن"، سینگے کا بیٹا "سنگ سنگ" اور احمد کا بیٹا جعفر اس نسل کے نمائندے ہیں جو اب سماج کے طبقاتی نظام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے علمی، ادبی اور فلاحی امور میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ناول میں اس نسل کی زندگی کے صرف ابتدائی پچیس تیس سال کا حصہ شامل ہے۔

ناول کا مرکزی خیال اسی طبقاتی نظام سے وابستہ مختلف کرداروں کی باہمی کشمکش پر مبنی ہے جو بلتستان کے سماجی نظام میں صدیوں رائج رہی ہے۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں کمزور طبقات نے تعلیم کا سہارا لیا اور ایک ایسا دور آیا کہ یہاں ہر طرف علم کی روشنی پھیلنے سے ماضی کے جبر کا اندھیرا چھٹ گیا۔ مصنف ہمیں دکھانا چاہتا ہے کہ تعلیم ہی وہ زیور ہے جس سے آراستہ ہو کر آج وہ نوجوان بھی محفل میں صدر نشین بن جاتا ہے جس کے آباواجداد سالہا سال معاشرتی ناانصافیوں اور مظالم کے سبب زیر دست رہنے پر مجبور تھے۔

مصنف خوسور گرونگ کے چوپال کا پہلا منظر بیان کرنے کے بعد بقیہ کہانی اخوند خدایار کی زبانی سنانا شروع کرتا ہے لیکن پورے ناول میں یہ راوی اور سامعین کہیں گم ہو جاتے ہیں اور ناول کے اختتام پر ایک دم پھر نمودار ہوتے ہیں۔ کہانی کے باقی پلاٹ اگرچہ مربوط ہیں لیکن راوی کا کردار کہانی میں غیر ضروری محسوس ہوتا ہے کیوں کہ یہ بات غیر فطری ہے کہ اخوند خدایار نے ایک ہی نشست میں بیٹھے بیٹھے آٹھ ابواب پر مشتمل اتنی لمبی کہانی سنا دی ہو اور سامعین اتنی دیر بیٹھ کر سنتے رہے ہوں۔ راوی پوری طرح کہانی میں جذب نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے قاری کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ناول کی کہانی میں انتظار یا تجسس کی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی جس سے ایک عام قاری جس کو بلتی ثقافت یا زبان سے دلچسپی نہ ہو اور محض ایک کہانی یا قصے کی طرح پڑھنا چاہے وہ اس شاید ناول کو پڑھتے وقت اپنا تجسس برقرار نہ رکھ سکے۔ سہیل بخاری کے بقول ناول کے واقعات میں دلکشی کا سامان ہونا ضروری ہے؛ جیسا کہ لکھتے ہیں:

> "متعدد مقامات پر اس میں مختلف تحریکات کے زیر اثر واقعاتی تنوع پیدا کیا جاتا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں سکون، اضطراب، تجسس، حیرت، مسرت اور غم وغیرہ کے مختلف جذبات پیدا ہوتے رہیں اور آئندہ واقعات معلوم کرنے کی فکر میں برابر لگا رہے۔" (۱۴)

مصنف نے خوسور گرونگ (خوسور گاؤں) کا محل وقوع اور جغرافیائی خدوخال واضح نہیں کیا ہے البتہ مختلف واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ خوسور گاؤں سکردو کے نواحی گاؤں قمراہ کے آس پاس کسی مقام پر واقع ہے جو دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی کے مختلف کردار سکردو آتے جاتے وقت زخ (مشکوں سے بنی مقامی کشتی) سے دریا پار کرتے ہیں اور ژھونگ دوس (سندوس) سے ہوتا ہوا کھر کھور (شاہی محل) تک جاتے ہیں اور اسی راستے زخ کے ذریعے دریا پار کر کے کئی گھنٹے پیدل چل کر اپنے گاؤں پہنچتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے لاشعوری طور پر اپنے آبائی گاؤں قمراہ کو خوسور گرونگ کے طور پر پیش کیا ہے۔

مصنف ناول کی کہانی کا عہد بھی واضح طور پر بیان نہیں کرتا لیکن واقعات کے تاریخی پس منظر کی مدد سے اس کے دور کا آسانی سے تعین کیا جا سکتا ہے۔ ناول میں جنگ آزادی گلگت بلتستان، یادگار شہدا سکردو کی تعمیر اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کی طرف واضح اشارے موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی آزادی بلتستان سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۴۷ء کے موسم خزاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگلے سال کے موسم گرما میں کہانی کا مرکزی کردار علی جنگ آزادی میں شرکت کرتا ہے۔ بلتستان کی آزادی کے بعد علی فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ یادگار شہدا سکردو کی تعمیر کے وقت علی کی ماں کا انتقال ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد علی ریٹائرڈ ہوتا ہے جس کے دو سال بعد اس کے والد اوت چن کا انتقال ہوتا ہے اور ایک سال بعد اس کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے جو پانچ سال کی عمر سے سکول جانا شروع کرتا ہے یعنی یہ تقریباً ۱۹۸۰ء کا سال ہوگا۔ اس کے بعد علی کا بیٹا سکر چن وکالت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے جس میں تقریباً ۱۸ سال لگے ہوں گے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناول کی کہانی زمانی اعتبار سے ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء تک کے دور پر مشتمل ہے۔ واضح رہے پاکستان کے یوم آزادی کے دن ہی بلتستان کی آزادی کا بھی دن ہے کیوں کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو سکردو چھاؤنی پر پاکستان کا پرچم لہرایا گیا تھا (۱۵) جب کہ یادگار شہدا سکردو کو بلتستان کے پولیٹیکل ایجنٹ بنات گل آفریدی نے ۱۹۶۴ء میں اپنی دوسری تعیناتی کے دوران بنوانا شروع کیا اور ۱۹۶۹ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ (۱۶)

جہاں تک "شہ سر" کے کرداروں کا تعلق ہے تو ان میں سے اکثر "خوسور گرونگ" کے سیدھے سادے لوگ ہیں جو کھیتی باڑی سے منسلک ہیں۔ اگرچہ مرکزی کردار اوت چن اور اس کے خاندان کے افراد ہیں لیکن ان کے علاوہ س گاؤں کے بعض دیگر خاندان اور افراد بھی کہانی میں حسب ضرورت اپنا کردار نبھاتے نظر آتے ہیں۔ خوسور گرونگ کے قریب کوڑے گرونگ اور چھوغو گرونگ نام کے دو گاؤں بھی واقع ہیں اور حسب ضرورت ان دو گاؤں کے ایک دو کردار بھی کہانی میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اوت چن زرعی امور سے آگاہ ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ گاؤں کے انتظامی امور میں اس کا کوئی خاص کردار نظر آتا۔ ایک اچھا شوہر ہے اور بچوں سے بہت شفقت سے پیش آتا ہے۔ اس کی بیوی سلطن کا کردار بہت اہم ہے۔ سگھڑ ہے اور بہت احسن طریقے سے گھر بھی چلاتی ہے اور بچوں کی تربیت بھی کرتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ کھیت اور کھلیان میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ساتھ کام کرتی ہے۔ امور خانہ داری اور گاؤں کے معاملات میں اپنے شوہر کو صلاح مشورے بھی دیتی ہے۔ شروع میں اوت چن اور اس کی بیوی کا کردار بہت نمایاں ہیں لیکن آہستہ آہستہ علی مرکزی کردار ادا کرنے لگتا ہے۔ کہانی کے آغاز میں یہ سترہ سال کا نوجوان ہے لیکن ہر کام میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتا ہوا نظر آتا ہے۔ دور دراز کے علاقوں سے سامان لانے یا پہنچانے کی ذمہ داری بھی نبھاتا ہے۔ جب بلتستان کی آزادی کی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس کے اندر وطن کی محبت کا جذبہ جوش مارتا ہے اور کم عمری میں پہلے جہاد میں حصہ لیتا ہے اور بعد میں فوج میں شمولیت اختیار کر کے مختلف محاذوں پر ڈیوٹی دیوتا ہے اور جنگ میں بھی بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوران

ملازمت گاؤں میں جائداد خرید کر اپنے آپ معاشرے کے بااثر افراد میں شامل کرنا چاہتا ہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد تعلیم کے فروغ کے لیے کوششیں کرتا ہے اور اپنے خاندان اور رشتہ داروں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیتا ہے اور تعلیم کے ذریعے معاشرے میں بدلاؤ لانا چاہتا ہے۔ اوت چن کا منجھلا بیٹا احمد کہانی کے آغاز میں بارہ سال کا بچہ تھا۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام انجام دیتا ہے۔ بعد میں کھیتی باڑی اور گلہ بانی تک محدود رہتا ہے۔ جسمانی طور پر مضبوط اور غصے کا تیز ہے۔ ناول میں اس کا کردار ثانوی نوعیت کا ہے۔ اوت چن کی اکلوتی بیٹی دس سال کی ہے اور چھوٹا بیٹا رگیالو تین سال کا ہے۔ ناول میں ان کا کوئی خاص کردار نظر نہیں آتا۔ رگیالو بعد میں فوج میں ملازمت اختیار کرتا ہے۔

کرگل سے مزدوری کے لیے آنے والا سترہ سالہ سینگے اس ناول میں دوسرا اہم کردار ہے۔ جنگ کے سبب یہ واپس اپنے گاؤں نہیں جا سکتا ہے جو تقسیم کے بعد بھارت کے قبضے میں ہوتا ہے۔ جنگ آزادی میں حصہ لیتا ہے۔ فوج میں بھی شمولیت اختیار کرتا ہے لیکن آخری وقت تک اپنے ماں باپ اور عزیزوں کی جدائی کا درد محسوس کرتا رہتا ہے۔ اسی سبب فوج سے نکالا جاتا ہے۔ پورے ناول میں صرف یہی ایک کردار اپنی محبوبہ سے بچھڑنے کا غم مناتا ہوا نظر آتا ہے۔

خوسور گرونگ کے دیگر اہم کرداروں میں ترنگپا وانگ دول، واتھول، خوستیک اور سید احمد شاہ قابل ذکر ہیں۔ وانگ دول گاؤں کا ترنگپا (نمبردار) ہے لیکن اس کا کردار بہت منفی ہے۔ اپنے ہی گاؤں کے کمزور افراد پر ظلم کرتا ہے۔ لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرتا ہے۔ کسی کو ترقی کرتا ہوئے دیکھے تو حسد کرنے لگتا ہے۔ عام لوگوں کو ہمیشہ دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ واتھول بھی ایک منفی کردار ہے اور وانگ دول سے منسلک ہے اور ہر ساز باز میں اس کا شریک ہے۔ "خوستیک" اوت چن کا رشتہ دار اور ہمسایہ ہے اوت چن کے ہر غم اور خوشی میں موجود ہوتا ہے۔ احمد شاہ سادات کا نمائندہ کردار ہے۔ گاؤں کی محافل و مجالس میں سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ فکری طور پر قدامت پرست ہے اور جدید تعلیم کی مخالفت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ خوسور گرونگ کے نمبردار کے برعکس کوڑو گرونگ اور چھوغو گرونگ کے نمبردار ترنگپا تقی اور ترنگپا قلبی بہت اچھے اخلاق کے مالک ہیں اور اپنے گاؤں کے کمزور لوگوں کا خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ ان کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں، اس کے باوجود یہ لوگ بھی تعلیم کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف بلا واسطہ کرداروں کی شخصیت نگاری نہیں کرتا بلکہ ان کے اعمال اور مکالموں کی مدد سے ان کی شخصی خوبی یا خامی واضح کرتا ہے۔ ناول میں اور بھی کئی کردار موجود ہیں لیکن ان سب کا تذکرہ اس مقالے کی گنجائش سے خارج ہے۔

"شہ سر" میں مصنف کی سب سے واضح خصوصیت اس کی جزئیات نگاری، منظر کشی اور مقامیت کا رنگ ہے۔ وہ ہر موسم اور اس سے متعلق رسوم و رواج اور طور طریقوں کی خوب صورتی سے تصویر کشی کرتا ہے۔ جب وہ خزاں کے آخری دنوں کا منظر بیان کرتا ہے تو قاری بھی اپنی چشم تصور سے دیکھ سکتا ہے کہ بھیڑ بکریاں اور دیگر مال مویشی گاؤں میں آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کچھ لوگ کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں اور کچھ دیگر لوگ اناج پسوا کر سردیوں کی تیاری کر رہے ہیں، پتے جڑھ رہے ہیں اور لوگ ان پتوں کو مویشیوں کے لیے محفوظ کر رہے ہیں، درختوں کو سردی اور جانوروں سے بچانے کے لیے ان کے تنوں کو گوبر یا پرانے کپڑوں سے ڈھانپ رہے ہیں؛ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے:

"ستون وخ پور گالے رگون وخ پو تھون مانینور یو دپا۔ بانگ نور رکدے لزا چک ژے ان پا۔ میونگ لوق چقپالا خلنگ زونین، ستون تھق مہ بب پھایو دپو نی رینٹھق کھیرین یو دپا۔ ستق جی لونونگ گر خموسی سکم سے بو دین یو د

پا۔ خوسور گرونینگ بوستر نگ بلبس لنگ سے شنگ لوے لونازدامونا، ستق جیونگ نااولی کھاستون چھوکل بونا، لق ژھوک لاشیلانگ سکوناگن رکیل بی اور یودپا۔"(۱۷)(ترجمہ حوالے کے ساتھ درج ہے۔)

ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گاؤں میں ہر طرف ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ مویشیوں کو بلانے کی آوازیں جیسے کچھ، کچھ، ہاچھ ہاچھ، پھریو، اوشکو اوشکو اور پھر جانوروں کی اپنی آوازیں جیسے قوقو، قہ قہ، بڑے بڑے، مے مے (بلتی میں گائے اور بھیڑ بکریوں کی آوازیں) سے خوسور گرونگ کی فضا گونج رہی ہوتی ہے۔

مصنف نے بعض اوقات منظر کشی میں شاعرانہ انداز بھی اپنایا ہے۔ مثلاً "سینگے" فوج میں ملازمت کے دوران کچھ عرصہ سرحدی گاؤں "ژے ژے تھنگ" میں تعینات رہتا ہے۔ اس دوران اس کو اپنے گاؤں کی یاد بہت ستاتی ہے کیوں کہ دریا کی دوسری طرف وہ اپنے گاؤں کو دیکھ سکتا ہے لیکن جا نہیں سکتا۔ ایک رات کرگل اور لداخ کے دریاؤں کے سنگم پر ایک چٹان پر بیٹھ کر بانسری بجاتا ہے اور اپنے عزیزوں کو یاد کر کے پوریگی زبان میں گانا گاتا ہے۔ اتنے میں چودھویں کا چاند نمودار ہوتا ہے جو بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس منظر کی اس طرح عکاسی کی ہے:

"لزے چوبجی ان پا۔ خنم پوساٹیلینگ تھنگ سے یودپا۔ لداخی رگیامژھونا کرگلی رگیامژھوے چھودریس پی سے کھا (سینگے سی) رگیامژھوے چھوربی سکدکن لاسنابین یودپا۔ دنساری لگونی برینگ ناچوبجی ژھنی لزودپو، سنہ چونگمو چیگی سی رگیانگ پھق لانا گوپھیونگماژوخ بیاسے شر۔ دوبی کھارژاق لزودپو رگیامژھوے سنگ سنگ چھوینگ نودوپا رگاشے نہ مسنینگ چن شیس۔"(۱۸)(ترجمہ حوالے کے ساتھ درج ہے۔)

قدیم بلتستان میں گرمیوں کے موسم میں چوپال کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی، جہاں بیٹھ کر لوگ گپ شپ کرنے کے علاوہ گاؤں کے مختلف امور کے فیصلے بھی کرتے تھے۔ اسی طرح سردیوں میں لوگ گھر کے زیر زمین بنے حصے میں منتقل ہو جاتے تھے جس کو "کژا" کہتے تھے اور جہاں ایک طرف انسان رہتے تھے اور دوسری طرف مویشیوں کو رکھا جاتا تھا اور بیچ میں لکڑی کی دیوار ہوتی تھی۔ جدید بلتستان میں "کژا" کی روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اس تہذیب سے جڑی اصطلاحات اور الفاظ بھی متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ مصنف کو اس بات کا شدت سے احساس ہے اسی لیے جب اوت چن کا خاندان سردیوں میں "کژا" میں منتقل ہوتا ہے تو مصنف "کژا" کے تہذیبی پس منظر سے متعلق ایک ایک لفظ اور اصطلاح کو بہ روئے کار لاتا ہے اور کژا کی بناوٹ اور اس کے عناصر ترکیبی کا تفصیل سے نقشہ کھینچتا ہے جس سے مصنف کی جزئیات نگاری کی صلاحیت آشکار ہوتی ہے۔ مصنف نے "کژا" سے جڑے الفاظ جیسے غبوس، کالیب، واکا، چھہ ستن، چھرا، چھوغوتھب، بنگ تھب، چھوتھب، کھری، پٹھل، شینگ ترا، پھلی، مہ غدونگ، غدونگ ما، کرل بول، بمبا، رکونگ بو، لم تین، کرکھونگ، ہلہ تھیم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر الفاظ آج کل شاذ و نادر ہی استعمال ہوتے ہیں۔

سردیوں کے موسم میں کنویں پر پانی لینے کے لیے آنے والی خواتین کی خوش گپیاں اور دکھ درد کی باتیں، بچوں کے مختلف سرمائی کھیل جیسے اپوس تیانگما، دونگ تانگما، رزاق پھنگما، پیوتانگما، چھولوتنگما وغیرہ اور موسم کی گھریلو دستکاریں جیسے سوت کات کر مختلف لباس اور بچھونے بنانے جیسی مقامی روایات سے جڑے اوزار، مشاغل اور مصنوعات جیسے رال کھلبا، بل ردابا، بل سملبا، رالی لونژے، بجو پھرنگ، بل کھور، کھ چونگ، دانا، پھنگ، پھنگو ژے وغیرہ کی بھی مفصل منظر کشی کی گئی ہے۔ مصنف ان روایات سے جڑی اصطلاحات کو بڑی خوب صورتی سے اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے تاکہ معدوم ہوتی ان روایات کی تاریخ کو زندہ رکھا جا سکے۔

اسی طرح بہار اور گرمیوں کے موسم میں ہم دیکھتے ہیں کہ پورا گاؤں سر سبز و شاداب ہو چکا ہے۔ توت، بید اور سفیدے کے درخت ہرے پتوں سے لد چکے ہیں اور کھیتوں میں فصلوں کی بالیاں نمودار ہو چکی ہیں اور شہتوت بھی پکنا شروع ہو چکے ہیں۔ بہت سارے موسمی پرندے جیسے نس بیو، ملابیو، ژھوق ٹیر، گرنمو، لونابیو، کنق بیو، ژیرن، غوتینگ، ڈیم چق، خاشیب، ہوہوب، مایون، چونگ (مقامی پرندوں کے بلتی نام) لوٹ آئے ہیں اور ان پرندوں کی آوازوں سے گاؤں کی فضا گونج رہی ہے۔ مصنف ہمیں بلتستان کے مختلف قسم کے کھیتوں کے نام، کھیتی باڑی کے اصول و قواعد، آب پاشی کا نظام، فصلوں کی بوائی اور گہائی کے طور طریقے، فصلوں کی اقسام، میوہ جات اور سبزیجات غرض ہر چیز کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

"شہ سر" میں چھوٹے بڑے بہت سے سماجی واقعات ذکر ہوئے ہیں جن میں علی اور میندیگار کی شادی قابل ذکر ہے۔ مصنف نے اس باب میں بلتستان کی شادی کی رسم و رواج کے ہر پہلو کا تفصیلی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ دلہا اور دلہن کے شادی کے ملبوسات، زیورات، شادی کی رسومات جیسے کھور رکاق پا، مربجوس، سین مورژی، کھب کھیر با، بخ ستون، ہلپا، ہل چونگ، سنیو پا، اود فسوس، تحفے تحائف کا تبادلہ، مہندی کی محفل میں منقبت پڑھنا، دلہا دلہن کو دودھ سے نہلانا (اوکھروس)، شادی کے ملبوسات پہنتے وقت "ہفت بند حسن کاشی" پڑھنا، دلہے کو مسجد لے جانا، محافل کے آداب، دعوتوں کا اہتمام، کھانوں کا انتظام، مہمانوں کا ہاتھ دھلوانا غرض ایک ایک چیز کی منظر کشی کی گئی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مصنف نے اتنی تفصیل کے باوجود ایک دو اہم پہلوؤں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ مثلاً قدیم سے بلتستان میں یہ رسم ہے کہ مہندی کی رات دلہا اور دلہن کے ہم عمر دوست احباب جمع ہو کر الگ الگ محفل موسیقی سجاتے ہیں جسے بلتی میں "التنمو" کہا جاتا ہے، جو اب بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ آج سے ستر سال پہلے یقیناً یہ رسم پوری آب و تاب سے جاری تھی لیکن مصنف نے ایسی کسی محفل کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح شادی کی ہر رسم اور روایت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن دلہا اور دلہن کے بیچ ایک معمولی مکالمہ یا کوئی بھی رومانوی منظر نہیں دکھایا گیا۔ نہ صرف شادی کے دن بلکہ بعد کے تمام مناظر میں بھی کبھی علی اور مندیگار کو ایک ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جا سکتا۔ گھر میں بھی علی کے ماں باپ اور اس کا بھائی احمد تو نظر آتے ہیں لیکن بیوی کے طور پر میندیگار کا کردار کہیں نظر نہیں آتا۔ دوران ملازمت چھٹی پر گھر آتے وقت میاں بیوی میں ملاقات ہوتی ہے اور نہ ہی واپس جاتے ہوئے اس کی بیوی اس کو حسرت سے جاتا دیکھ رہی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ معاشرتی جبر ہے یا مصنف کا مذہبی رجحان کہ پورے ناول میں رومانوی اور جوانوں کی محفل آرائیوں کا عنصر مکمل طور پر مفقود ہے۔ رومانوی عنصر کا مفقود ہونا بلتی سماج کا ایک افسوس ناک پہلو ہے۔ شاید اسی لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کرگل کے نوجوان "سینگے" کو کرگل سے اس کی محبوبہ کا لکھا ہوا ایک خط شامل کیا گیا ہے جو کسی حد تک رومانس کی کمی کو دور کرتا ہے، البتہ اس میں صرف ہجر و فراق کا عنصر ہی غالب ہے۔ یہ خط جنگ آزادی بلتستان سے کچھ دن قبل موصول ہوا تھا لیکن جنگ کی وجہ سے سینگے کبھی واپس کرگل نہیں جا سکا۔ اس خط میں محبوب کی جدائی کے درد کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> "یانگ نابریسے نی سنینگ لاچی گوین یود زیر بو یانگ لاچی رتخ فا۔ نانابریسے لوکھور گو انیر سید۔ یانی شوق شوق چک کھوانگ مہ ربیں، ہنا پھرن چی سامہ تنگس۔ دی لوکھور پو ناسی چی یسے رگل چو کسید، یانگ لاچی رتخ فا۔ نلانی گا ہیش ریریو لوستونگ ریرے پالچو سونگس۔ ناجعی یری بربے ژھرنگ سی ینگ ژھیک سے خشو گوین یود۔ دی

شوق شوق پو تھو بفی۔ نگسی کھا یانگ لوق سے یولینگ اونگ، میدنہ نا یانگ نا بربے سے خسونے می لوس۔ یغزی یانگ مہ اونگس نارے ناکر گل چھوینگ نو چھونگ فی ان۔"(۱۹)(ترجمہ حوالے کے ساتھ درج ہے۔)

اس ناول میں بعض تاریخی واقعات کو بھی کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے جن میں جنگ آزادی بلتستان سب سے اہم ہے۔ اس جنگ میں گلگت سکاؤٹ کے جوانوں کے ساتھ مقامی لوگ بھی بھرپور حصہ لیتے ہیں جن میں سے بعض افراد دوسری جنگ عظیم میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ناول کے دو اہم کردار علی اور سینگے بھی اس جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ناول میں آزادی کے لیے دی جانے والی قربانیوں کے تذکرے کے ساتھ ڈوگرا فوج اور غیر مسلم سول افراد کے ساتھ روا رکھے جانے والے بعض مظالم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس جنگ میں ۶۷ مجاہد اور ۳۰۰ کے قریب (بقول مصنف) بے دین لوگ قتل ہوئے۔ مصنف ہندوستان کے لیے "بوت یول" اور پاکستان کے لیے "ہلژخمہ یول" کے نام استعمال کرتے ہیں جو میری نظر میں مناسب نہیں ہے۔ "بودیول" تبت کو کہا جاتا ہے جب کہ بلتی میں ہندوستان کو "رگیا کریار گیا گر" کہا جاتا ہے لہذا ہندوستان کو "بودیول" قرار دینا درست نہیں۔ اسی طرح پاکستان کو نام کو ترجمہ کر کے "لژخمہ یول" کہنا بھی ذوق سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔

ڈوگرا راج کے خاتمے سے جہاں اہل بلتستان کو خوشیاں نصیب ہوئیں وہیں مختلف خاندانوں کے بچھڑنے اور ایک ہی علاقے کے دو الگ ملکوں میں بٹ جانے کے سبب پیدا ہونے والا کرب بھی بار بار "سینگے" کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف بلتستان کے مختلف گاؤں کے پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم ہونے سے یہاں کے مختلف خاندانوں کے بچھڑنے کے غم سے بخوبی آگاہ ہے جس کے اثرات آج بھی بچھڑے خاندانوں کے مختلف افراد کی کہانیوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

"شہ سر" بلتی زبان کا پہلا ناول تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ نکتہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی کہانی، ماحول، فضا، کردار، موضوعات اور مضامین سب بلتی سماج سے جڑے ہوئے ہیں اور پورے ناول میں مقامی رنگ نمایاں ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ اکثر کرداروں کے لیے بلتی زبان یا اور بلتستان کے تاریخی پس منظر سے ہم آہنگ ناموں کا انتخاب کیا جائے؛ جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اوت چن، سکر چن، سینگے، رگیالو، واتھول، وانگ دول، وانگ چوک، خوستیک، غوتے، کھی چو،، کاٹے، فوکو، ہانو، تنژشے، واتھول،، مانچو، بغدور، غومبور، پھہ چو، شورو، بوڑو، نقچو، یوقتو، چھوتک، موتک جیسے نام یا تو خالص بلتی کے ہیں یا بلتستان کے تاریخی روایتی ناموں میں سے ہیں۔ اسی طرح عربی، فارسی سے لیے گئے اکثر ناموں کو ان کے اصل تلفظ اور املا کے ساتھ لکھنے کے بجائے ان کی بگڑی ہوئی مقامی شکل میں استعمال کیا ہے۔ جیسے سلطن بی (سلطان بی)، فطیم بی (فاطمہ بی) ماجان (ماہ جان)، سلبی (سلمی بی)، ماسین (محمد حسین)، مایل (اسماعیل)، ہاجربی (ہاجرہ بی)، غلم (غلام)، ماقولن (ماہ قلی) اور احمہ شا (احمد شاہ)، ماخان وغیرہ۔ البتہ بعض غیر مقامی ناموں کو بغیر تغیر و تبدل کے بھی ہیں جیسے مایار، خدایار، علی، احمد، جعفر، کاظم، احمد شاہ، نرگس، رستم اور موسی وغیرہ۔

پورے ناول میں بلتی روایتی کھانوں کا ہی استعمال ہو رہا ہے۔ ان کھانوں میں مرزن، رژب کھور، پراپو، اذوق، شہ سپق، ژھونما، پایو چا، کھوربا، تروس کھور، جاڑی، گنگ تھور، دربی ژھہ مک وغیرہ معمول کی عام غذائیں ہیں اور دعوتوں میں بھی یہی کھانے کھلائے جا رہے ہیں۔ علی کی ریٹائرمنٹ (تقریباً ۱۹۷۲ء) کے بعد مصنف نے پہلی بار چاول کے استعمال کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح بلتستان بھر میں استعمال ہونے تمام تر گھریلو برتن، مختلف اوزار اور کھیتی باڑی کے سامان اور زیورات وغیرہ سب مقامی ہیں اور ان میں سے اکثر چیزوں کے نام بھی مقامی ہیں؛ جیسے غزوا، رہ ژیر، کوات، ڈنگو، چھنگ رکیال، دیگ بو، کوروم بو، بجو، زربو، شینگ کورے، مونگور، پھوتو، فوکونو، پٹلی، کوڑے فتیلہ، ٹھہ لو، بلے سکید، کیالبو، ساور، لژانا، چورونگ، چورا، تنیگ، تومار، پھوق بو، چھہ سکور، پھرا پھلو،

کوق چینگ وغیرہ۔ ۱۹۷۲ء کے بعد آہستہ آہستہ مقامی مصنوعات کی جگہ غیر مقامی اشیاء کے استعمال کا رجحان بڑھتا نظر آتا ہے، مثلاً سب سے پہلے علی کے بیٹے سکر چن کی پیدائش پر ان کے گھر میں پیتل کی تھال، پلیٹ، کٹورے اور پیالیوں کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔

اس ناول میں جہاں دیگر بڑے واقعات، سماجی مسائل اور لوگوں کے شب و روز کی مصروفیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، وہیں ان واقعات کے ضمن میں بلتستان کے بعض چھوٹی موٹی روایات، آداب و رسوم، توہمات اور دلچسپ معاشرتی پہلوؤں کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- موسمی تہواروں اور غمی خوشی کے موقع پر حسب استطاعت قریبی رشتہ داروں کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں خاص طور پر گھر کی بہن بیٹیوں کو ضرور بلایا جاتا ہے۔
- قدیم بلتستان میں ایک مزدور بھی گھر کے بیٹھک میں سب کے ساتھ بیٹھ گھر کے ایک فرد کی طرح کھانا کھاتا تھا۔ یہ روایت اب عام طور پر ختم ہو گئی ہے۔
- رگون نیم کھیم (۲۱ دسمبر کا دن) کو خصوصی دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مسلسل تین جمعراتوں کو جشن مے پھنگ (آگ کی مشعل اور الاؤ روشن کرنے کا جشن) منایا جاتا ہے۔ رگون نیم کھیم کے دن سورج اپنا سرمائی سفر مکمل کر کے گرمائی سفر شروع کرتا ہے۔ بعض تبتی علاقوں میں انہی دنوں میں نئے سال کا جشن بھی منایا جاتا ہے۔
- کسی پریشانی کی صورت میں سادات کو گھر بلوا کر ان سے دعا کرواتے ہیں۔ بلتستان میں سادات بہت قابل احترام سمجھے جاتے ہیں اور مانا جاتا ہے کہ ان کی دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ آزادی میں شرکت کے بعد علی کے شہید ہونے یا زندہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ملتی اور جیسے ہی سادات کو گھر بلوا کر ان سے دعا کرواتے ہیں، تین دن اندر علی خیر و عافیت سے گھر واپس پہنچ جاتا ہے۔
- شادی بیاہ کے بعد قریبی رشتہ دار اور دوست احباب دلہا اور دلہن اور ان کے گھر والوں کو شادی کی دعوتوں پر بلاتے ہیں جسے "بوس زن" کہا جاتا ہے جو آج بھی قائم و دائم ہے۔
- کسی عزیز کے انتقال پر بھی رشتے دار سوگوار خاندان کے لیے دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جسے بلتی میں "زدوگ سکیور" کہا جاتا ہے۔ یہ رسم بھی ابھی تک باقی ہے۔
- کسی کے انتقال پر پردیس میں موجود اس کے عزیزوں کو بلا واسطہ غم کی خبر نہیں دی جاتی تھی بلکہ اس کے واپس آنے پر گاؤں کے لوگ ان کے گھر پر جمع کر علاقائی روایات کے مطابق مرثیہ پڑھ کر تعزیت کی جاتی تھی لیکن تیز رفتار ذرائع ابلاغ کے سبب یہ روایت کمزور پڑ گئی ہے۔
- لڑائی جھگڑے کی صورت میں پولیس کیس کرنے کے بجائے گاؤں کے بزرگ صلح صفائی کے ذریعے معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- سفر یا کسی خاص کام کے لیے جاتے وقت آٹا صدقہ دیا جاتا ہے اور گھر سے باہر جانے والا اس پر ہاتھ رکھ کر جاتا ہے۔
- پاکستان بننے کے بہت عرصہ بعد تک خرید و فروش اور لین دین وغیرہ کے معاہدے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔
- بدھ کے دن کسی کام کا آغاز کرنا بدشگون سمجھا جاتا ہے۔
- زچہ بچہ کے سرہانے قران کے ساتھ ایک کلہاڑی بھی رکھی جاتی تھی جو شاید اب بھی کہیں کہیں موجود ہو۔

لسانی جائزہ:

بلتی زبان میں اب تک نثر نگاری کا باقاعدہ رواج نہیں ہوا ہے اور اب تک جو ادب تخلیق ہوا ہے وہ شعری صورت میں ہے۔ نثری تخلیقات کے بغیر کوئی بھی زبان علمی، فکری، ادبی اور تاریخی موضوعات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات پر بلتی میں لکھتے اور بولتے وقت زبان و بیان کی نارسائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ بلتی زبان کی تمام تر لسانی محدودیت کے باوجود پہلی بار پورا ناول تحریر کرنا 'شہ سر" کے مصنف کی قدرت بیان اور مہارت زبان کا واضح ثبوت ہے۔ داستان گوئی کی روایت بلتستان میں موجود رہی ہے لیکن جدید ناول نگاری بلتی زبان کے لیے بالکل نئی صنف ہے اس کے باوجود پورے ناول میں بہت ہی شستہ اور روان زبان استعمال کی گئی ہے اور غیر بلتی الفاظ کا استعمال بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو غیر بلتی الفاظ ناول کا حصہ بنے ہیں، ان میں سے اکثر عربی فارسی کی اسلامی اصطلاحات ہیں جو اب بلتی زبان کا ہی حصہ شمار ہوتے ہیں۔ صدیوں سے بلتی زبان میں رائج ہونے کے سبب اب ان میں سے اکثر الفاظ کے املا اور تلفظ پر مقامی رنگ غالب آچکا ہے۔ اس ناول میں استعمال ہونے والے غیر بلتی الفاظ کی تعداد شاید سو سے زیادہ نہیں ہے، جن میں سے بعض درج ذیل ہیں: معجزہ، مجید (مسجد)، مرتد، بہشت، جہنم، حسنہ، صیغہ (نکاح)، ہفت بند، سجدہ، عَلَم، شکر، مرحبا، برکت، خدا، دعا، پشین (ظہر)، بنگ (بانگ، اذان)، نیاد نذر (نیت و نذر)، ماتم، ماتم سرا (امام بارگاہ)، مرثیہ، شہید، فاتحہ، مجاہد، سید، اخوند، تقشہ (طاقچہ)، چیلا (چلہ، چہلم)، سکاؤٹ، پلٹن، یونٹ، امینیشن ڈپو، کاشن، پنشن، میڈیکل بورڈ، صوبیدار، توپ خانہ، گولی، حشر، ڈاکٹر، افسر، تار، انگریز، عرضی، وکالت، تھال، سٹیل، پودینہ، اذوق (فارسی آذوق)، کلچہ (کلوچہ)، خوان، روزی، میزان (فارسی مہینے کا نام)، بخاری (ہیٹر)، فوکونو (فارسی فوکن، پھونک مارنے کا آلہ)، بواریک (مبارک)، وخ (وقت)، لٹھا، لالٹین، انگون (آنگن)، لعن (لگن-برتن) وغیرہ۔

لسانی اعتبار سے "شہ سر" کی ایک اور اہم خصوصیت بلتی کے متروک الفاظ کا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ بعض صورتوں میں مصنف نے خود بھی چند ایک لفاظ اختراع کرنے کی کوشش ہے جن کو واضح کرنے کے لیے قوسین میں ان الفاظ کے اردو معنی بھی درج کر دیے ہیں۔ مصنف نے بلتی کے موجودہ ذخیرہ الفاظ کا ممکنہ حد تک استعمال کیا ہے، اسی لیے ایسے نامانوس یا نئے الفاظ بہت کم نظر آتے ہیں۔ بہر حال جو نئے الفاظ مصنف نے خود بنائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

- "ہلوق اود" کا مطلب مصنف نے "بجلی کی روشنی" لکھا ہے۔ یہ لفظ دیگر تبتی زبانوں میں بھی رائج ہے لیکن یہاں "اود" اضافی ہے۔
- "گرون چس" "گاڑی" کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بلتی میں "گرون چس" سے مراد کوئی بھی سواری مراد لی جا سکتی ہے اس لیے یہ لفظ گاڑی کے مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔ بھاپ سے چلنے والی گاڑی کو دیگر تبتی زبانوں میں "خلنگس کھور" (بھاپ سے چلنے والی شے) کہا جاتا ہے۔
- "شیس کھنگ" سکول کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ بھی سکول کے مفہوم کو پوری طرح بیان نہیں کرتا کیوں اس سے مراد "علم کا گھر" ہے جو سکول، کالج، مدرسہ، یونیورسٹی غرض کسی بھی علمی مرکز کا توصیفی نام ہو سکتا ہے۔
- "لدانگ بو" کلاس یا جماعت" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اصل معنی زینے کی پیڑی ہے لہذا یہ لفظ بھی فصیح نہیں ہے۔
- "نیسی ریسی میولی چھو غو تھانو" دوسری جنگ عظیم کا لفظی ترجمہ ہے، البتہ بلتی میں مصطلح نہیں ہے۔
- "یول سنہ" ملکی سرحد کے لیے استعمال کیا ہے۔ تبتی زبانوں میں ژھم" لفظ رائج ہے جو بلتی میں بھی قابل فہم ہے۔

- "ہلن ہر تخ" پرچم کے لیے مصنف کی ذہنی اختراع ہے اور مبہم لفظ ہے۔

ان الفاظ کے علاوہ سمن کھنگ (ہسپتال)، سمن پا (ڈاکٹر)، رمق کھنگ (چھاؤنی)، رژوم (شعر، ادب) سمیو گو (قلم)، پاروس (قوم یا قبیلہ)، لغم (لڑکی کا رشتہ مانگنا)، نل ژھو (چھٹی)، چھوہانگ پا (ملاح، کشتی بان) جیسے بعض بلتی الفاظ بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن کو عوام الناس سمجھ تو سکتے ہیں لیکن ان کا استعمال مخصوص طبقات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے البتہ پاروس، لغم، سمیو گو اور چھوہانگ کو اب بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مصنف نے بعض الفاظ کے لیے ان کے قدیمی اور بگڑے ہوئے تلفظ کو اختیار کیا ہے جن میں سکر دو کے بجائے "سکاڑو" اور گلگت کے بجائے "گلیت" قابل ذکر ہیں۔

بلتی زبان اور بلتی سماج کی ایک اہم خصوصیت اس میں موجود نفرین اور بد دعائیہ کلمات وعبارات کی وسعت ہے۔ بلتی لوگ غم وغصے کی حالت میں انسان یا حیوان ہی نہیں بے جان اشیا کو بھی بد دعائیں دیتے ہیں جن کو بلتی میں "رمون مو" کہا جاتا ہے۔ بلتی زبان "رمون مو" کی تعداد اور تنوع کے لحاظ سے بہت مالا مال ہے جو یہاں کے لوگوں کی بے بسی، ذہنی تناؤ اور مایوسی کی علامت ہے۔ بلتی زبان میں بد دعا پر مبنی الفاظ و تعبیرات کی ایک لمبی فہرست ہے جس کے علاوہ اس زبان میں موقع کی مناسبت سے بے ساختہ ایسے جملے اور عبارتیں بیان کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ بلتستان کے مشہور مورخ اور ثقافتی امور کے ماہر جناب حسن حسرت ان بد دعاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "بلتی زبان کی بے ساختہ نکلنے والی بد خواہی کی یہ عبارتیں بلتستان کی مختلف وادیوں میں قدرے مختلف بھی ہیں جو بلتستان کے لوک ورثے کا ایک حصہ ہیں۔" (۲۰) اگر "شہ سر" کا اس تناظر میں جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس میں دعائیہ کلمات تو بہت ہی شاذ نادر استعمال ہوئے ہیں جب کہ نفرین اور بد دعائیں دل کھول کر دی گئی ہیں۔ مثلاً جب واتھول اور ترنگ پاوانگ دول احمد (اوت چن کا منجھلا بیٹا) کو زخمی حالت میں گھر کے باہر پھینک کر چلے جاتے ہیں تو میندیگار (احمد کی بھابھی) گھر کی چھت پر کھڑی ہو کر چلا چلا کر وانگ دول اور اس کے خاندان والوں کو بد دعائیں دینا شروع کرتی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے:

> "لے لقپی گڈینگ نابو دپا سونگ فی وانگ دول، لے گڑہ ہڑس سونگ فی وانگ دول، لے فڈ مل لا سونگ فی وانگ دول، لے کھور لونگ مسونگ فونگ، لے ننگ مل لایق رانتگما سونگ فونگ، لے رب چھد پا سونگ فونگ، لے سہ کھوڑاغد ماسونگ فونگ" (۲۱) (ترجمہ حوالے کے ساتھ درج ہے۔)

بلتی زبان ضرب الامثال اور محاورات کے لحاظ سے بھی ایک خاص شناخت رکھتی ہے۔ بلتی زبان کی امثال و محاورات میں ایک وسعت اور جامعیت پائی جاتی ہے جن کو بلتی میں "تم لو" کہا جاتا ہے۔ محترم حسن حسرت کے مطابق "بلتستان کی محفلوں میں لوگ ضرب الامثال کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ بلتی زبان ضرب الامثال کی دولت سے مالا مال ہے۔" (۲۲) بلتی میں ضرب الامثال اور محاورات میں فرق نہیں رکھا جاتا جیسا کہ مرحوم غلام حسن حسنی نے اپنی کتاب "تم لو" میں محاورات اور ضرب الامثال دونوں کو ایک ساتھ رکھا ہے۔ (۲۳) بلتی زبان میں ان ضرب الامثال اور محاورات کی اہمیت اور کثرت سے استعمال کے سبب "شہ سر" میں بھی جابجا ان کا استعمال دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ناول میں استعمال ہونے والے چند اہم محاورات اور ضرب الامثال درج ذیل ہیں:

محاورات: زگید پوی کھ ژھوکھ میچوکپو (چولہے کے پتھروں پر ٹکنے نہ دینا / غربت کی آخری حد کو پہنچانا)، سنینگ کھروسے خپیر اتنگمو (خلوص دل سے بات کرنا)، گیود پی رتا تنگ سے بگیو کھ نامی نو نما گو (بعد کے پچھتاوے کا فائدہ نہ ہونا)، جینگما گرا جو کھ فو (نقصان گلے پڑنا)، چھوزن گو (پانی میں غرق ہونا)، شل شل لتو (بے بسی سے دیکھنا)، سپلبا ژھیک پو (نصیب پھوٹنا)، ننگ لتو ینگ نانق

غبول بیونگ مو (پیٹ سے / آستین سے سانپ نکلنا)، سنینگ نیریم دوک پو (دل میں کدورت ہونا)، مک ٹھوب گو (آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانا)، چھو بیو (معاف کرنا)، نیما غزیرنگ کمنو (سورج کا غروب ہونے کے قریب ہونا)، بزینگ چوکپو (پانی کو صاف کرنا، دو بندوں میں رنجش دور کرنا، صلح کرانا)، لق پی ٹھواغی کھاریل ستدپو (اچانک یا عجلت میں کوئی تقریب منعقد کرنا)۔

ضرب الامثال: رکو نما برید چوگ، لس می تھد چوگ (چور کی مرمت کرو، مزدور کی خدمت کرو۔)، خنم تھنگ بگیا تھیوق خنم کھور چک مہ تھیوق (سو دنوں کی دھوپ سے ایک دن کی بارش زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔)، نئی شے میدنا پھری درے مید (گھر کے اندر سے اشارہ نہ ہو تو باہر کا بھوت بھی نہیں۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔)، یول گو لالنگ پھی لدوم لدوم یول جوک لا (کسی علاقے کے ایک سرے سے اٹھنے والی گرد دوسرے سرے تک پہنچتی ہے۔ ناخوشگوار واقعے کا اثر پورے ملک پر ہوتا ہے۔)، بونوے زگونا رینٹھغی زگو (بیٹی کے گھر کا دروازہ اور گراٹ کا دروازہ، یعنی گراٹ پہ بھی لوگوں کا آنا جانا رہتا اور بیٹی والے گھر میں بھی رشتے کے لیے لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے۔)، چولی نابونوے بوژھا (خوبانی اور لڑکی ذات، یعنی لڑکیوں کی وقت پر شادی کر دینی چاہیے نہیں تو خوبانی کی طرح پک کر گر جائے گی۔)، ننگ مید کھنگ مید نمزابول کھانگ برو، بومید ژھامید رگس کھانگ برو (بے خانماں شخص کو سر شام اور بے اولاد شخص کو بڑھاپے میں احساس ہوتا ہے۔)، مے پھوانہ سے ژھیک (آگ جلتی ہے تو ساتھ مٹی بھی جلتی ہے۔)، بیانگ بوژیر بایود، موتک چق پا یود (مکھی نچوڑیں اور موتی توڑیں، یعنی قناعت کے وقت قناعت کریں اور سخاوت کے وقت سخاوت)، رتا تھیکھ بانگ گنگ، می تھیکھ گوم گنگ (گھوڑے کی پہچان ایک جست میں، انسان کی پہچان ایک قدم میں ہو جاتی ہے۔)، پنپی تھیکھ ناگومبا (پنڈلی کے مطابق قدم، یعنی اپنی طاقت کے مطابق کام کرنا چاہیے)، نور تنگ سے مید پی ژون مین، رنگ لا سکے سے مید پی بو مین (مال دے کر جب تک خریدا نہ جائے غلام نہیں، جب تک اپنا سگا نہ ہو بیٹا نہیں)، ژھن گونی تھیکھ ناکنگمار کیونگ (چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔)، پھوروق لا کھب تھوب پھاژوخس (کوے کے ہاتھ جیسے سوئی لگ جائے۔ یعنی پیٹ کا ہلکا ہونا)، پھایول بجید ناپھ سکد مہ بجید (ماں دھرتی کو بھولو تو ماں بولی کو مت بھولنا)، بلتی لا ونگ تھوب ناکون جو غی کھا کھور کول (بلتی کو اگر حکومت اقتدار ملے تو خدا پر بھی بوجھ لادے گا۔)، رژو چک نالگو چک (ایک گری کا دانہ کھالیں اور ایک چوٹی سر کر لیں)، برق لا شخما پھنگ پھاژوخ (چٹان پر کنکر پھینکنے جیسا، یعنی باتوں کا بے اثر ہونا)۔

بلتی زبان کا صوتی اور ہجائی نظام بہت پیچیدہ ہے، اس لیے اس کی آرتھوگرافی (اصول املا) ہمیشہ سے ایک متنازعہ موضوع رہی ہے۔ بلتی کے قدیم رسم الخط ایگے (Yige) کے متروک ہونے اور اصوات کی علمی شناخت اور حروف و اعراب میں ضروری تبدیلیوں کے بغیر عربی-فارسی کے رسم الخط کو بلتی لکھنے کے لیے استعمال کرنے کے سبب بلتی زبان کے اکثر الفاظ غلط املا کے ساتھ رائج ہو گئے ہیں، جس کے سبب ان الفاظ کی لغوی ساخت اور ہیئت کو پہچاننا دشوار ہو گیا ہے۔ اگرچہ اب کچھ حروف اور اعراب کا اضافہ کیا گیا ہے لیکن بہت دیر ہو چکی ہے اور اس کو عوام میں مقبولیت بھی حاصل نہیں ہے۔ بلتی زبان کے احیا و ترقی کے لیے اس کے سابقہ تبتی رسم الخط کا دوبارہ اجرا بہت ضروری ہے۔ "شہ سر" کا سب سے کمزور پہلو بھی یہی ہے کہ اس میں املا کی بے شمار غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ بعض الفاظ کے املا کے اختلاف کو علاقائی لہجے پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن بعض حالات میں ایک ہی لفظ کو مختلف جگہوں پر مختلف املا کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جیسے مثلاً "خوسور" اور خسور"، "ہلچنگ را" اور "ہلچنگ را"، "شینگیال" اور "شنگیال"، "کھب" اور "کھاب"، "رانگ یول" اور "رنگ یول"، "رگیمژھو" اور "رگیامژھو"، "ڈوگرا" اور "ڈوگورا"، "خستیک" اور "خس تیک" "زان" اور "ذان" "کژی" اور 'کہ ژی" وغیرہ۔

اسی طرح بلتی زبان میں صوتیات اور ہجائی نظام کی شناخت کے لیے کوئی مبسوط کام نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر شعرا اور ادیب بھی لفظ کی ساخت اور اجزا کو سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں اور اس پر مستزاد رسم الخط کی نارسائی اس مسئلے کو اور بھی الجھا دیتی ہے۔ "شہ سر" میں بہت سے الفاظ جن کو ملا کر لکھنا چاہیے الگ اور جن کو الگ لکھنا چاہیے ملا کر لکھا گیا ہے جس سے قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ جیسے "چیلہ" (فارسی لفظ چلہ) کی جمع "چی لونگ" درج ہے جب کہ "چیلونگ" لکھنا درست تر ہے۔ "جینگ" اور "شینگ" پر "یائے نسبت" اضافہ ہونے پر اسے "جی نی" اور "شی نی" لکھا گیا ہے بہتر تھا "جینی" اور "شینی" لکھا جاتا۔ اسی طرح "نینور (نیمور) کو "نی نور" نینا (نیما) کو "نی نا"، "شوہرو (ہندی شوکرو، جمعہ) کو "شوہ رو" "میگنگ" کو "می گینگ" لکھا گیا ہے حال آں کہ انکو ملا کر لکھنا چاہیے ۔ اس کے برعکس کئی مقامات پر ایسے مرکب الفاظ جن کے اجزا کو الگ لکھنا چاہیے، ان کو ملا کر لکھا گیا ہے۔ جیسے "رگلو کھسینگ" (رگالو کھسینگ)، ژھیرینگمو (ژھے رینگ مو)، "ننگنو" (ننگ نو)، "اونگسنا' (اونگس نا)، "ردبسے" (ردب سے)، "سننگلہ" (سنینگ لا)، "لزوقسے" (لزوق سے)، "تھوننا" (تھون نا) وغیرہ۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کو مصنف نے "مارفیم" کی بنیاد پر اجزا کو الگ لکھنے کے بجائے "ہجاؤں (syllables) کی بن یاد پر توڑ کر لکھا ہے جس سے لفظ کی ہیئت بگڑ گئی ہے۔ جیسے "پھو-رژید" کو "فور- سد"، "رگہ سکد" کو "رگس-کد"، "چھ ستن" کو "چھس- تن"، "بو- رژے" کو "بور-ژے" اور "مہ غدونگ" کو "مق غدونگ" لکھا گیا ہے۔

"شہ سر" میں درجنوں املائی غلطیاں ہیں لیکن بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کو لکھنے میں لفظ کی اصالت کے بجائے سہل پسندی پر مبنی عامیانہ صورت کو اپنایا گیا ہے۔ کسی لفظ کی عامیانہ صورت اگر کسی کردار کی زبانی ادا ہو تو ہم اس کو کردار کا لہجہ قرار دے کر صرف نظر کر سکتے ہیں لیکن اکثر اوقات مصنف نے اپنے بیان میں لفظ کی عامیانہ صورت کا استعمال کیا ہے جو قابل گرفت ہے۔ اس زمرے کے کچھ الفاظ درج ذیل ہیں جن کے سامنے قوسین میں ممکنہ درست صورت درج ہے: ہلٹینس (رتینس)، اوت فسون (اود فسوس)، لق ہرژیب (لق لژیب)، ٹورین (ترودین) یوکھ (جوکھ)، فروق (پھوروق)، ہرژینگ (ہری سنگھ)، سہ سک (سہ ژھک)، غم شود (غم نچود)، شود (چھود)، بف نا (ببس نا)، فاف نا (پھبس نا)، ریڑے فیڑے (ریرے پھیدلے) وغیرہ۔

نتیجہ گیری:

اس تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بلتی زبان کے پہلے ناول "شہ سر" میں بلتستان کے سماجی اور تاریخی حالات و واقعات، مذہبی اور معاشرتی روایات، طرز زندگی، تہوار، رسوم و رواج، خوراک و پوشاک، موسموں کا تغیر و تبدل، حیوانات، پرندے، فصلیں، جاگیر داری نظام پر مبنی طبقاتی کشمکش اور تعلیم و تربیت کے اثرات وغیرہ کو ناول کی کہانی، کردار، ماحول اور مکالموں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جنگ آزادی بلتستان سے لے کر بیسویں صدی کے آخری سالوں پر مشتمل بلتستان کی تین نسلوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول پر مقامی رنگ غالب ہے جس میں بلتستان کے تہذیبی اور ثقافتی اقدار و روایات کے ساتھ ساتھ بلتی زبان کے معدوم ہوتے الفاظ و تعبیرات کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ منظر کشی اور جزئیات نگاری اس کی سب سے اہم مثبت پہلو ہے۔ کرداری نگاری متوسط درجے کی ہے جب کہ اس کا سب سے کمزور پہلو کہانی میں تجسس، انتظار اور رومانس جیسے عناصر کی کمی اور املا اور خط تحریر میں غلطیوں کی بہتات ہے۔ لسانی اعتبار سے اس میں تہذیبی پس منظر کے حامل بے شمار الفاظ کو یکجا کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر ایک لغت بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔ افضل روش نے اس ناول کے ذریعے بلتی زبان، تاریخ اور

ثقافت کی بہت بڑی خدمت کی ہے جس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں اور یہ ناول بلتی ادبی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات و کتابیات:

۱۔ رک: محمد حسن حسرت، بلتستان تہذیب و ثقافت، سکردو: بلتستان بک ڈپو اینڈ پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۶۶-۶۸

2. Nicolas Tournadre, Hiroyuki Suzuki, The Tibetic Languages: An introduction to the family of languages derived from Old Tibetan, Paris: Lacito, 2023, pg 78
3. Ralf Vollmann, Descriptions of Tibetan Ergativity A historiographical account, Graz: Leykam, 2008, pg 10

۴۔ غلام حسن حسنو، ثقافت بلتستان، لاہور: الفیصل، ۲۰۲۲، ص ۱۲۶

۵۔ محمد حسن حسرت، بلتستان مشمولہ: پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات، لاہور: لوک ورثہ، ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۱-۲۶۳

۶۔ محمد یوسف حسین آبادی، تاریخ بلتستان، سکردو: بلتستان بک ڈپو، ۲۰۱۹ء، ص ۵۳

۷۔ غلام حسن حسنو، ثقافت بلتستان ۲۰۲۲، ص ۱۲۵-۱۲۶؛ محمد حسن حسرت، بلتستان تہذیب و ثقافت، ص ۱۲۳-۱۲۴

۸۔ محمد حسن حسرت، حشمت علی کمال الہامی، غلام حسن حسنی، بلتی شوقبو، سکردو: بلتستان بک ڈپو، ۲۰۱۵ء

۹۔ رک: محمد افضل روش، پھہ ہر تخ، سکردو: محمد افضل روش، ۲۰۰۵

۱۰۔ افضل روش، کوائف نامہ (مصنف کا فراہم کردہ)

۱۱۔ محمد علی شاہ بلتستانی، بلتی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳، ص ۲۳۶

۱۲۔ افضل روش، شہ سر، سکردو: افضل روش، ۲۰۲۴، ص ۱۱

۱۳۔ محمد نذیر، ڈاکٹر ذکیہ رانی، بلتستان میں اردو افسانے کا ارتقا، مشمولہ: تحقید، جلد ۵، شمارہ ۱، (فیصل آباد، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، ۲۰۲۴ء)

۱۴۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، دہلی: الحمرا پبلشر، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲

۱۵۔ محمد یوسف حسین آبادی، تاریخ بلتستان، ص ۲۸۴

16. Nasir Ansari Official, History of Yadgar-e-Shuhada Chowk, Skardu, Gilgit Baltistan Documentary [Video], (16 Aug 2023). YouTube. www.youtube.com/watch?v=Y1INobo6Zaw

۱۷۔ افضل روش، شہ سر، ص ۱۶-۱۷، (خزاں گزرنے والی اور سردیاں آنے والی تھیں۔ جانوروں کو کھلا چھوڑ کر ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ لوگ زمین کو نرم کرنے کے لیے ہل چلا رہے تھے۔ جن گھروں کا اناج پسائی کا کام باقی تھا وہ اناج پسوا رہے تھے۔ سردی کے سبب درختوں کے پتے خشک ہو کر گر رہے تھے۔ خوسور گاؤں کے بچے عورتیں سب پت جڑھ کے پتے جمع کرنے، درختوں اور گھاس کے میدانوں کو پانی دینے اور پودوں کو گوبر اور کپڑوں کے ڈھانپ کر محفوظ کرنے میں مشغول تھے۔)

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۶، (مہینے کی چودہ تاریخ تھی۔ آسمان بھی بالکل صاف تھا۔ (سینگے) لداخ اور کرگل کے دریاؤں کے سنگم پر بیٹھ پانی کی لہروں کا شور سن رہا تھا۔ سامنے کی چوٹیوں کے بیچ سے چودھویں کا چاند دیوار کی اوٹ سے نکلنے والی کسی دوشیزے کی طرح نمودار ہوا۔ اس پر مستزاد دریا کے سفید اور شفاف پانی میں اس کا عکس اور بھی دل فریب نظر آ رہا تھا۔)

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۸، (آپ کیا جانے کہ آپ سے بچھڑنے کے بعد مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ مجھ سے بچھڑ کر سال ہونے کو آیا ہے۔ آپ نے ایک خط بھی نہیں لکھا اور نہ کوئی پیغام بھیجا۔ آپ کیا جانے کہ یہ ایک سال میں نے کیسے گزارا ہے۔ مجھے ایک ایک سانس ایک ہزار سال سے بھاری لگ رہا ہے۔ میں ہر روز آپ کی جدائی کی آگ میں جل کر کباب ہو رہی ہوں۔ جیسے ہی یہ خط ملے، آپ فوراً گاؤں واپس آجائیں، نہیں تو آپ کی جدائی میں جی نہیں پاؤں گی۔ اگر آپ نہ آئیں تو میں دریائے کرگل میں کود کر جان دے دوں گی۔)

۲۰۔ محمد حسن حسرت، بلتستان، مشمولہ: پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات، ص ۲۹۴

۲۱۔ افضل روش، شہ سر، ص ۱۳۷-۱۳۸، (اے وانگ دول، تیرے ہاتھوں کے جوڑ الگ ہو جائیں۔ اے وانگ دول، تیرے اعضا الگ الگ ہو جائیں۔ اے وانگ دول، تیرا موقع پر ہی دم نکل جائے۔ اے وہ لوگ جنہیں جینا نصیب نہ ہو۔ اے وہ لوگ جن کے گھر کی جگہ پودوں کی نرسری لگ جائے۔ اے وہ لوگ جن کی نسل ختم ہو جائے۔ اے وہ لوگ کہ زمین دوز کمرا ان کا نصیب بن جائے۔)

۲۲۔ محمد حسن حسرت، بلتستان، مشمولہ: پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات، ص ۲۹۳

۲۳۔ رک: غلام حسن حسنی، تم لو (بلتی ضرب الامثال و محاورات)، سکردو: شبیر پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء

References in Roman Script:

1. Muhammad Hassan Hasrat, Baltistan Tehzeeb-o-Saqafat, Skardu: Baltistan Book Depot and Publications, 2007, p. 66-67
2. Nicolas Tournadre, Hiroyuki Suzuki, The Tibetic Languages: An introduction to the family of languages derived from Old Tibetan, Paris: Lacito, 2023, p:78
3. Ralf Vollmann, Descriptions of Tibetan Ergativity A historiographical account, Graz: Leykam, 2008, p:10
4. Ghulam Hassan Hasnu, Saqafat-e-Baltistan, Lahore: Al-Faisal, 2022, p:126
5. Muhmmad Hassan Hasrat, Baltistan, in: Pakistan ka Saqafati Encyclopedia Shumali Ilaqajat, Lahore: Lok Virsa, 2004, p :261-263
6. Muhammad Hussain Yousaf Hussain Abadi, Tarikh-e-Baltistan, Skardu: Baltistan Book Depot, 2019, p : 53
7. Ghulam Hassan Hasnu, Saqafat-e-Baltistan, pg. 126 & Muhammad Hassan Hasrat, Batitstan Tehzeeb-o-Saqafat, p :123-124
8. Muhammad Hassan Hasrat, Hashmat Ali Kamal Ilhami, Ghulam Hassan Hasni, Balti Shoqbu, Skardu: Baltistan Book Depot, 2015
9. Muhamma Afzal Rawish, Pha-Hrtakh, Skardu: Muhammad Afzal Rawish, 2015
10. Muhmmad Ali Shah Baltistani, Balti Urdu Lughat, Islamabad, Muqtadira Qaumi Zaban, 2003, p :236
11. Afzal Rawish, Curricula Vitae (Provided by Himself)
12. Afzal Rawish, Sha-sar, Skardu: Afzal Rawish,2024, p :11

13. Muhammad Nazir, Dr. Zakia Rani, Baltistan main Urdu Afsane ka Irtiqa, in: Tahqeed,Vol. 5 (1), (Faisalabad, Udu Department, GC Women University, 2024, p. 1-12
14. Suhail Bukhari, Urdu Naval Nigari, Delhi, Al-Hamra Publisher, 1972, p. 22
15. Muhammad Hussain Yousaf Hussain Abadi, Tarikh-e-Baltistan, p. 284
16. Nasir Ansari Official, History of Yadgar-e-Shuhada Chowk, Skardu, Gilgit Baltistan Documenta [Video], (16 Aug 2023). YouTube: www.youtube.com/watch?v=Y1INobo6Zaw
17. Afzal Rawish, Sha-sar, p. 16-17
18. Ibid, p.116
19. Ibid, p-158
20. Muhmmad Hassan Hasrat, Baltistan, in: Pakistan ka Saqafati Encyclopedia, p-294
21. Afzal Rawish, Sha-sar,p-137-138
22. Muhmmad Hassan Hasrat, Baltistan, in: Pakistan ka Saqafati Encyclopedia, p-293
23. Ghulam Hassan Hasni, Tamlo (Balti Zarb-ul-Amsal wa Muhawarat), Skardu: Shabbir Printing Press, 2004